النار (۵) میں بھی فتویٰ کا لفظ مذکور ہے۔

شریعت کی اصطلاح میں زندگی کے کسی شعبہ سے متعلق پیش آمدہ مسائل میں دینی رہنمائی کا نام فتویٰ ہے۔ بالفاظِ دیگر کسی بھی مسلمان کو کوئی مشکل مسئلہ درپیش ہو تو اس کے استفتاء پر قرآن وحدیث اور ان سے اخذ کیے ہوئے اصول وتشریحات کی روشنی میں علمائے دین اور مفتیانِ کرام جو حکمِ شرعی بتاتے ہیں، اسی کا نام فتویٰ ہے۔(٦)

یاد رہے کہ فتویٰ کسی حاکم یا مفتی کی ذاتی رائے کا نام نہیں کہ جس پر عمل کرنا ضروری نہ ہو، جیسا کہ انٹرنیٹ کی دنیا کی معروف ویب سائٹ wikipedia پر فتویٰ کی یہ تعریف کی گئی ہے کہ ''کسی اسلامی مسئلے پر فقیہوں یا مفتیوں کا شرعی حکم جو کسی امر کے جواز یا عدمِ جواز کے بارے میں دیا جائے فتویٰ کہلاتا ہے۔فتویٰ کی حیثیت رائے کی ہے، اور یہ حکم کا درجہ نہیں رکھتا''،(۷) نیز ہمارے جدید تعلیم یافتہ طبقے کا یہ کہنا کہ فتویٰ کی حیثیت صرف کسی شخص کی ذاتی رائے کی ہے یہ حکم کا درجہ نہیں رکھتا، دعویٰ بلا دلیل ہے۔اس کے مقابلے میں متعدد دلائل سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ فتویٰ قرآن وحدیث کی تشریح کا نام ہے، جو کہ ایک مسلمان کے لئے واجب العمل اور لائقِ تقلید ہے۔

فتویٰ کی اہمیت وتاریخی پس منظر

فتویٰ کی تاریخ بہت قدیم اور اس کی نسبت بہت اونچی ہے، اس لئے قرآن پاک میں ''افتاء'' کا لفظ خود اللہ رب العزت کیلئے بھی استعمال ہوا ہے، ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

ویستفتونک فی النساء ،قل اللہ یفتیکم فیھن ومایتلیٰ علیکم فی الکتاب.(۸)

''اور لوگ آپ سے عورتوں کے بارے میں حکم دریافت کرتے ہیں، آپ فرمادیجئے کہ اللہ تعالیٰ ان کے بارے میں حکم دیتے ہیں، اور وہ آیات بھی جو قرآن کے اندر تم کو پڑھ کر سنائی جاتی ہیں۔''

اور کلالہ کے بارے میں جو آیت نازل ہوئی ہے اس میں بھی ''افتاء'' کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف کی گئی ہے۔ارشادِ ربانی ہے:

یستفتونک، قل اللہ یفتیکم فی الکلالۃ.(۹)

''لوگ آپ سے حکم دریافت کرتے ہیں، آپ فرمادیجئے کہ اللہ تعالیٰ تم کو کلالہ کے بارے میں حکم دیتے ہیں''

آپ ملاحظہ فرمائیں کہ ان آیات میں ''افتاء''یعنی فتویٰ دینے کی نسبت خود اللہ رب العزت کی طرف کی گئی ہے جس سے اس منصب کی جلالتِ شان کا اندازہ ہوتا ہے، اور یقیناً یہ نسبت اس شعبے کی اہمیت وافضلیت کی سب سے بڑی دلیل ہے۔اور کیوں نہ ہو کہ کوئی بھی مسلمان خواہ ولی ہو، قطب ہو، محدث ہو، مفسر ہو، مؤرخ ہو، غرض جو بھی ہو وہ اپنی معلومات میں مفتی کا محتاج ہے۔بغیر اس کی کدو کاوش اور تحقیق وجواب مسئلہ کا حل آسان نہیں ہے۔کوئی شخص یہ دعویٰ نہیں کرسکتا کہ مجھے اپنی زندگی میں کسی مرحلے پر کوئی ایسا سوال سامنے نہیں آیا جس میں فتہ وفتویٰ کی طرف رجوع کی ضرورت

نہیں پڑی۔

ملتِ اسلامیہ کے سب سے پہلے مفتی

تاریخ کے حوالے سے ہم دیکھیں تو امت کے سب سے پہلے مفتی خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات بابرکت ہے، اور یہ دولت آپ صلی اللہ علیہ وسلم تک اللہ رب العزت کی طرف سے پہنچی۔ چنانچہ دورِ رسالت میں رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم خود مفتی الثقلین تھے، اور منصبِ افتاء پر فائز تھے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم وحی کے ذریعہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے فتویٰ دیا کرتے تھے۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے فتاویٰ (احادیث) کا مجموعہ شریعتِ اسلامیہ کا دوسرا بڑا ماٰخذ ہے، جس سے سرتابی کا خیال بھی ایک مسلمان کے لئے گناہ عظیم ہے۔

قرآن کریم میں ارشاد ہے

وان تنازعتم فی شیئ فردوہ الی اللہ ورسولہ ان کنتم تؤمنون باللہ والیوم الأخر ذلک خیرواحسن تأویلاً.(۱۰)

''پھر اگر تم کسی امر میں اختلاف کرنے لگو تو اس امر کو اللہ اور اس کے رسول کی طرف حوالے کیا کرو اگر تم اللہ اور یومِ آخرت پر ایمان رکھتے ہو، یہ طریقہ سب سے بہتر ہے اور اس کا انجام خوش تر ہے''۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فتاویٰ کے ذریعہ ہر باب میں رہنمائی فرمائی ہے۔ عبادات، معاملات، معاشرت، اخلاقیات وآداب وغیرہ میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے فتاویٰ مشعلِ راہ ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہدِ زرّیں میں کوئی دوسرا فتویٰ دینے والا نہیں تھا۔ البتہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کبھی کبھی کسی صحابی کو کسی دور دراز علاقہ میں مفتی بنا کر بھیجتے تو وہ منصبِ افتاء وقضاء پر فائز ہوتے، اور لوگوں کی رہنمائی کرتے، جیسے حضرتِ معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یمن بھیجا اور انہیں قرآن وحدیث اور قیاس واجتھاد کے ذریعہ فتویٰ دینے کی اجازت مرحمت فرمائی۔

دورِ رسالت کے بعد منصبِ افتاء

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد اس عظیم الشان منصب پر آپ ﷺ کے وہ جلیل القدر، صاحبِ بصیرت صحابہ کرامؓ فائز ہوئے، جن کے متعلق اللہ تعالیٰ کا ارشادِ گرامی ہے:

رضی اللّٰہ عنھم ورضواعنہ. (۱۱)

''اللہ تعالیٰ ان سے راضی وخوش ہوئے اور یہ اللہ تعالیٰ سے خوش اور راضی ہیں''

اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے: **اصحابی کالنجوم فبأیھم اقتدیتم اھتدیتم۔(۱۲)**

''میرے صحابہ ستاروں کی مانند ہیں، ان میں سے تم جس کی پیروی کروگے ہدایت یاب ہوگے''۔ اور جنہیں کتاب وسنت کا فہم خصوصی حاصل تھا۔

اور جن کے باب میں امت کا فیصلہ ہے کہ: ألين الأمة قلوباً وأعمقها علماً وأقلّها تكلّفاً وأحسنها بياناً وأصدقها أيماناً وأعمّها نصيحةً وأقربها الى الله وسيلة۔(۱۳)

''(صحابہ کرام) امت میں سب سے زیادہ نرم دل، سب سے زیادہ گہرے علم والے، سب سے کم تکلف والے، اور حسنِ بیان میں سب سے بڑھ کر ہیں، اسی طرح ایمان میں سب سے زیادہ سچے، خیر خواہی میں سب سے آگے اور باعتبار وسیلہ اللہ سے قریب تر ہیں''

چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد فتویٰ کی ذمہ داری کو صحابہ کرام رضوان اللہ علیھم اجمعین نے سنبھالا اور احسن طریقے سے انجام دیا۔

صاحبِ فتویٰ صحابہؓ کی تعداد

حضراتِ صحابہ کرام رضوان اللہ علیھم اجمعین میں جو فتویٰ دیا کرتے تھے، اس کی مجموعی تعداد ایک سو تیس سے بھی زائد ہے، جن میں مرد بھی شامل ہیں، اور عورتیں بھی۔ البتہ زیادہ فتویٰ دینے والے سات صحابہ کرام رضوان اللہ علیھم اجمعین تھے۔ حضرتِ عمر فاروق رضی اللہ عنہ، حضرتِ علی رضی اللہ عنہ، حضرتِ عائشہ رضی اللہ عنھا، حضرتِ عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ، حضرتِ زید بن ثابت رضی اللہ عنہ اور حضرتِ عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ۔ (۱۴) اس کے بعد تعلیم و تربیت اور فقہ وفتویٰ کا سلسلہ حضراتِ صحابہ رضی اللہ عنھم کے شاگردوں نے سنبھالا اور دل و جان سے اس کی حفاظت کر کے اسے اگلی نسلوں تک منتقل کیا۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنھم کے زمانے میں فتوحات ہوئیں، اسی وجہ سے وہ دور دراز علاقوں میں پھیل گئے۔ چنانچہ ہر جگہ ان کے شاگرد تیار ہوئے، مدینہ منوّرہ میں حضرات سعید بن المسیبؒ، عروہ بن زبیرؒ، عبید اللہ بن عبداللہ بن عتبہؒ، قاسم بن محمدؒ، سلیمان بن یسار، خارجہ بن زید، ابوسلمہ بن عبدالرحمٰن بن عوف رحمھم اللہ تعالیٰ۔ ان حضرات کو فقہاءِ مدینہ یا فقہاءِ سبعہ کہا جاتا تھا، مکہ مکرّمہ میں عطاء بن ابی رباح، عبدالملک بن جریج علی بن ابی طلحہ۔ کوفہ میں ابراھیم نخعی، علقمہ، عامر بن شراحیل شعبی۔ بصرہ میں حسن بصریؒ، یمن میں طاؤس بن کیسان، شام میں مکحول وغیرہ (رحمھم اللہ رحمۃً واسعۃً)۔ (۱۵) ان حضرات کے فتاویٰ مصنفات، سنن، اور مسندات وغیرہ میں موجود ہیں۔

دورِ صحابہؓ کے بعد فتاویٰ

صحابہ کرامؓ کے بعد تابعین، اور تابعین کے بعد تبع تابعین پھر بعد کے علماء وفقہاء نے یہ سلسلہ جاری رکھا۔ امام ابوحنیفہؒ (المتولد ۸۰ھ والتوفی ۱۵۰ھ) تابعین میں سے ہیں، آپ کی پیدائش کے وقت متعدد صحابہ کرام رضوان اللہ علیھم اجمعین کوفہ میں موجود تھے، آپؒ نے آٹھ صحابہ کرام رضی اللہ عنھم اجمعین سے روایت بھی فرمائی۔ (۱۶) آپؒ استنباطِ مسائل

میں حد درجہ احتیاط فرماتے تھے، آپ کے پاس علمائے کرام کی ایک جماعت جمع ہوتی اور اس میں ہر فن کے ماہرین ہوتے تھے جو اپنے علم وفن میں کامل رسوخ کے ساتھ خدا ترسی، فرض شناسی وغیرہ اوصاف حمیدہ سے متصف تھے، خود امام صاحبؒ اس جماعت کے صدر کی حیثیت سے شریک ہوتے۔ کوئی مسئلہ پیش آتا تو سب مل کر بحث ومباحثہ اور غور وخوض کرتے، جب سب علماء ایک بات پر متفق ہو جاتے تو امام ابوحنیفہؒ اپنے تلمیذِ خاص امام ابو یوسفؒ کو حکم دیتے کہ اس کو فلاں باب میں لکھ لو۔ اللہ تعالیٰ نے آپؒ کو ایسے لائق شاگرد عطا فرمائے کہ جنہوں نے آپؒ کے علوم کو دنیا کے چاروں اطراف میں پھیلا دیا۔

علامہ ابن عابدین شامیؒ کی تحقیق کے مطابق یہ تعداد چار ہزار تک ہے۔(۱۷) چنانچہ خلفائے عباسیہ کے دور سے لے کر گزشتہ صدی کے شروع ہونے تک اکثر اسلامی ممالک میں فقہ حنفی قانونی شکل میں نافذ ورائج رہا۔

پاک وہند میں فتویٰ نویسی

ہندوستان میں سلطنتِ مغلیہ کے زوال اور برطانوی آبادکاروں کے تسلط کے بعد فتویٰ کا کام دینی مدارس کی طرف منتقل ہو گیا۔ اور اب یہ کام دینی مدارس کے ذریعہ ہی انجام پا رہا ہے، دینی مدارس نے فقہ وفتویٰ کی یہ عظیم ذمہ داری نہایت احسن طریقے سے نبھائی۔ فقہ وفتویٰ کے سلسلے میں مدارس کے علماء ومفتیانِ کرام خصوصاً حضرت مفتی رشید احمد گنگوہیؒ، حضرت مولانا خلیل احمد سہارنپوریؒ، حضرت مفتی عزیز الرحمٰن عثمانیؒ، حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ، حضرت مفتی کفایت اللہ دہلویؒ، حضرت مفتی محمد شفیع عثمانیؒ، حضرت مفتی محمود حسن گنگوہیؒ رحمھم اللہ نے فقہ وفتویٰ کے سلسلے میں عظیم الشان خدمات انجام دیں۔ اور ان حضرات کے فتاویٰ اور فقہی رہنمائی نے مسلمانانِ برصغیر بلکہ عالمِ اسلام تک کو فائدہ پہنچایا۔

مفتی کی اہمیت وذمہ داری

اس سے انکار نہیں کہ مسائل واحکام کا بڑا ذخیرہ دراصل قرآن وسنت ہی ہے۔ لیکن اتنی بات تو ہر صاحبِ عقل وخرد تسلیم کرے گا کہ قرآن وحدیث کے اندر ایک خاص انداز میں حقائق واحکام پر روشنی ڈالی گئی ہے، اور یہ بھی مسلّم ہے کہ عموماً ہر شخص کو ہر زمانے میں حالات یکساں پیش نہیں آتے، بلکہ مختلف ڈھنگ سے صورت حال سامنے آتی ہے، اور عادتاً سب لوگوں میں ایسی فہم وبصیرت نہیں ہوتی کہ ہر شخص قرآن وحدیث سے اپنے حالات کے مطابق ہر ہر جزئیہ کا جواب حاصل کر لے۔ دوسری طرف ہر مسلمان کو اللہ تعالیٰ کی جانب سے یہ قطعی حکم ملا ہے کہ اپنے قول وفعل (جس کو وہ انجام دینا چاہتا ہے) کے متعلق اگر اسے نہیں معلوم کہ خدائی قانون (شریعت) کہاں تک اس کی اجازت دیتا ہے، اور اجازت کی صورت میں اس کے کیا حدود وشرائط ہیں؟ تو عقلی گھوڑے دوڑانے کی بجائے اس کے لئے لازم ہے کہ

قانونِ الٰہی کے ان واقف وتجربہ کار علماء وفقہاء سے رجوع کرے جن کو مسلم سماج میں اعتماد حاصل ہے، اور ان سے اپنے مسئلے کی نوعیت بتلا کر حکمِ شرعی معلوم کرے، جس کو "استفتاء" کہتے ہیں۔

قرآنِ کریم میں أولو الأمر (۱۸) کی طرف مراجعت اور ان کی اطاعت کو واجب اور ضروری قرار دیا گیا ہے، ایک تفسیر کے مطابق أولــو الأمــر سے مراد حضرات علماء وفقہاء ہیں۔ علامہ ابوبکر جصاصؒ نے حضرات جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ، عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ وغیرھم سے نقل کیا ہے کہ أولوا الامر سے مراد علماء وفقہاء ہیں۔ (۱۹)

اس طرح بعض دیگر آیات سے بھی علماء کی اتباع اور شرعی احکام کو معلوم کرنے کے لئے ان کی طرف مراجعت کو ضروری قرار دیا گیا ہے۔ قرآن کریم میں ہے: "فاسئلوا اھل الذکر ان کنتم لاتعلمون" (۲۰) ترجمہ "سو پوچھو یاد رکھنے والوں سے اگر تم کو معلوم نہیں"۔ دوسری جگہ ارشاد ہے: "واتّبع سبیل من اناب الیّ" (۲۱) "اور راہ چل اس کی جو رجوع ہوا میری طرف"۔

لہٰذا ان آیات کی روشنی میں علماء کرام نے لکھا ہے کہ عام مسلمان پر ضروری ہے کہ جب کسی معاملہ میں دینی رہنمائی مطلوب ہو تو حکمِ خداوندی معلوم کرنے کے لئے مفتیانِ کرام کی طرف رجوع کرے، جیسا کہ حضرات صحابہ کرامؓ درپیش دینی معاملات میں حضرات نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف رجوع کرتے تھے، اور جس طرح حضراتِ صحابہ کرامؓ کے زمانے میں دیگر صحابہ وتابعین فقہائے صحابہؓ سے دینی رہنمائی حاصل کرتے تھے۔

فتویٰ دینے کا منصب بہت اہم اور نازک ہے، فقہاء کرام اور مفتیانِ عظام کی وہ جماعت جنہوں نے خود کو استنباطِ احکام اور استخراجِ مسائل کے لئے مختص کیا اور حلال وحرام کو معلوم کرنے کے لئے قواعد وضوابط مرتب کئے، وہ انبیاء کرام کے حقیقی وارث ہیں۔ حدیث مبارکہ ہے: العلماء ورثۃ الانبیاء (۲۲) "علماء انبیاء کے وارث ہیں"۔

مفتی کیلئے شرائط

علماء نے لکھا ہے کہ افتاء کا منصب ایک اہم ذمہ داری ہے، اس وجہ سے اس منصب پر بیٹھنے والے شخص یعنی مفتی کیلئے کڑی شرائط ہیں جو ان شرائط اور معیارات پر پورا اترے گا وہی اس منصب پر فائز ہوسکتا ہے۔ چنانچہ علماء نے کتبِ فتاویٰ میں ایسی تمام شرطوں کو بالتفصیل بیان کیا ہے کان مفتی میں پایا جانا ضروری ہے۔

وہ شرائط درج ذیل ہیں:

۱) علم وفہم

مفتی کیلئے سب سے پہلی شرط یہ ہے کہ وہ کتاب وسنت کا عالم ہو، اور اس نے یہ علم معتمد ومستند علماء سے باضابطہ طور پر حاصل کیا ہو، اس کے علم کی بنیاد صرف ذاتی مطالعہ نہ ہو۔

چنانچہ علامہ ابن عابدین الشامیؒ نے عقود رسم المفتی میں لکھا ہے کہ فتویٰ کوئی ایسا شخص دے سکتا ہے جس نے علومِ دینیہ معتمد علماء سے باضابطہ حاصل کئے ہوں، اور صاحبِ بصیرت ہو، اس کے لئے چند کتابوں کا پڑھ لینا کافی نہیں۔ بلکہ فتویٰ ایسا ماہر دے سکتا ہے جس نے لائق و فائق اہلِ علم سے اخذِ علم کیا ہو اور اسے خود اس فن میں مہارتِ تامّہ اور ملکہ راسخہ اس طرح حاصل ہو چکا ہو کہ وہ صحیح کو غیر صحیح سے ممیز کر سکے، اور مسائل اور اس کے متعلقات سے قابلِ اعتماد طور پر واقف ہو۔(۲۳)

امام احمد بن حنبلؒ کی رائے کے مطابق بھی فتویٰ صرف ایسا شخص ہی دے سکتا ہے جسے کتاب وسنت پر گہری نظر ہو، اور فقہ میں بصیرتِ تامہ حاصل ہو، اور فتویٰ کی صلاحیت ہو۔ چنانچہ امام احمد بن حنبلؒ فرماتے ہیں کہ:

''مسندِ افتاء پر وہی بیٹھنے کی جرأت کرے جو وجوہِ قرآن، اسانیدِ صحیحہ اور سنن نبوی صلی اللہ علیہ وسلم سے پورے طور پر واقف ہو''۔ ایک دفعہ آپؒ نے فرمایا: لا یجوز الفتیا الاّ لرجل عالم بالکتاب والسنة (۲۴) ''فتویٰ دینا جائز نہیں مگر اس شخص کے لئے جو کتاب وسنت کا عالم ہو''۔

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ فرماتے ہیں کہ جو شخص پوچھنے والے ہر سوال کا جواب بے سوچے سمجھے دینے لگے وہ ''پاگل'' ہے۔ الفاظ یہ ہیں: ان من افتی الناس فی کل مایسألونه عنه لمجنون(۲۵) ''جو شخص لوگوں کے تمام سوالوں کا جواب دینے کے لئے تیار بیٹھا رہے وہ پاگل ہے''

حضرت سعید بن سحنونؒ کا فرمان ہے: أجرأهم علی الفتیا أقلهم علماً(۲۶) ''فتویٰ پر بڑا بے باک وہ ہوتا ہے جو کم علم ہوتا ہے''۔ ان حضرات کی مراد یہ ہے کہ فتویٰ دینے کیلئے علم وفہم ضروری ہے بغیر علم وفہم کے فتویٰ دینا جہالت ہے۔

معروف محقق ڈاکٹر یوسف القرضاوی نے فرماتے ہیں کہ:

''فتویٰ بھی قضاء کی طرح ہے، چنانچہ جائز نہیں ہے کہ ایک ایسے عالم کے علاوہ کوئی شخص لوگوں کو فتویٰ دے جسے اپنے علم پر قدرت ہو اور اسے دین کی سمجھ حاصل ہو۔ ورنہ وہ حلال کو حرام اور حرام کو حلال کرے گا، واجبات کو ساقط کرے گا یا لوگوں پر ایسی باتیں لازم کرے گا جو اللہ تعالیٰ نے ان پر لازم نہیں کی ہیں۔ وہ اہلِ ایمان کی تکفیر کرے گا اور کافروں کے کفر کو وجہ جواز فراہم کرے گا۔ یہ ساری چیزیں یا ان میں سے اکثر کی وجہ یہی ہوتی ہے کہ آدمی میں علم وفقہ کی کمی ہو۔ خاص طور پر یہ بات کہ آدمی فتویٰ دینے پر جری ہوتا ہے یا اس کی حرمت کو پامال کرتا ہے یا ہر کس وناکس کو اس اجازت دیتا ہے تو اس کی وجہ علم کی کمی ہوتی ہے۔ جیسا کہ ہم اپنے دور میں دیکھ رہے ہیں جس میں دین ایک بازیچہء اطفال بنا ہوا ہے کہ جو چاہے اس کے بارے میں رائے زنی کرے جو کچھ نہ کچھ بول سکتا ہو یا کچھ لکھ سکتا ہو تو وہ دین کے بارے میں کہنا اور لکھنا شروع ہو جاتا ہے۔ حالانکہ قرآن وسنت اور سلف صالحین نے اس کے بارے میں شدت کے ساتھ تاکید کی ہے کہ اس کی شرائط اور اہلیت کے بغیر دین میں رائے

زنی نہ کی جائے۔اور وہ شرائط بھی ایسی ہیں کہ انہیں اپنے اندر جمع کرنا اوران کی پوری پوری قدرت حاصل کرنا بہت مشکل ہوتا ہے۔'' (۲۷)

۲) خوفِ خدا

مفتی کی شرائط میں سے ایک شرط یہ بھی ہے کہ اس میں خوفِ خدا ہو۔یعنی جواب دیتے وقت اپنے دل میں خوفِ خدا کا پورا احساس رکھتا ہو۔اور جو جواب دے خوب دیکھ بھال کے بعد دے تاکہ فتویٰ میں کسی بھی قسم کی غلطی سے بچا جا سکے۔

۳) غور وفکر

مفتی کیلئے ایک شرط یہ بھی ہے کہ اس میں غور وفکر کی اعلیٰ صلاحیت ہو تاکہ وہ درست نتائج تک پہنچ سکے۔یہ بات یقینی ہے غور فکر کی صلاحیت سے محروم شخص فتویٰ کا کام انجام نہیں دے سکتا۔

۴) معتمد علماء کی صحبت

مفتی کیلئے ایک شرط یہ بھی کہ اس نے ایک معتد بہ عرصہ معتمد علماء کی صحبت میں گزار کر اپنی نفس کی اصلاح کی ہو، تاکہ فتویٰ دیتے وقت وہ کسی باطنی بیماری مثلاً تکبر، حسد، کینہ، بغض اور خود پسندی وغیرہ کا شکار نہ ہو۔

۵) ماہر اساتذہ کا تربیت یافتہ ہونا

ایک شرط یہ بھی ہے کہ مفتی نے فتویٰ کی تربیت معتمد علماء اور ماہر اساتذہ سے حاصل کی ہو، اور ایک طویل عرصے تک اپنے اساتذہ کی زیرِ نگرانی فقہ فتویٰ کا کام کر چکا ہو۔یہ بات یاد رہے کہ صرف ذاتی کتب بینی اور ذاتی مطالعے کی بنیاد پر فتویٰ دینا درست نہیں۔جیسا کہ آج کل کچھ لوگ ایسا کر رہے ہیں۔علامہ شامیؒ نے لکھا ہے کہ:

> **وقد رأيت في فتاوى العلامة ابن حجر العسقلانیؒ سئل في شخص يقرأ ويطالع في الكتب الفقهية بنفسه ولم يكن له شيخ ويفتيٰ ويعتمد على مطالعة الكتب،فهل يجوز له ذالک ام لا .فأجاب بقوله لايجوز له الافتاء بوجه من الوجوه لأنه عامي جاهل لايدري مايقول ،بل الذي يأخذ العلم عن المشائخ المتبحرين(۲۸)**

''میں نے علامہ ابن حجر العسقلانیؒ کے فتاویٰ میں یہ بات دیکھی ہے کہ آپ سے ایک ایسے شخص کے متعلق پوچھا گیا جو کتبِ فقہ پڑھتا ہے اور خود سے مطالعہ کرتا ہے، کوئی اس کا استاد نہیں ہے، اور وہ اپنے مطالعہ کتب پر اعتماد کرتے ہوئے افتاء کا کام کرتا ہے، تو کیا یہ اس کے لئے درست ہے یا نہیں؟ آپ نے جواب دیا ایسے شخص کیلئے افتاء کا کام کرنا کسی طرح بھی درست نہیں ہے، اس لئے کہ درحقیقت وہ عامی اور جاہل ہے، اسے خود معلوم

نہیں کہ وہ کیا کہہ رہا ہے، بلکہ فتویٰ دینا ان لوگوں کا کام ہے جنہوں نے مستند علماء ومشائخ سے علم حاصل کیا ہو۔''

٦) زمانہ کے عرف وعادت سے واقفیت

مفتی کے لئے زمانہ کے عرف وعادت سے واقف ہونا بھی ضروری ہے، علامہ ابن عابدین شامیؒ لکھتے ہیں:

وکذالابدّلہٗ من معرفتہ عرف زمانہ وعرف اھلہ. (۲۹)

''اور ایسا ہی مفتی کے لئے عرفِ زمانہ کی معرفت اور اپنے دور کے لوگوں کے احوال سے واقفیت ضروری ہے۔قنیہ میں ہے کہ مفتی اور قاضی کے لئے یہ درست نہیں ہے کہ عرفِ زمانہ صرفِ نظر کر کے صرف ظاہر مذہب پر فتویٰ دے۔(۳۰)

حضراتِ علمائے کرام نے مفتی کے لئے کچھ مزید شرائط بھی ذکر کی ہیں، وہ مندرجہ ذیل ہیں:

(۷) وہ کسی ماہرِ فقہ کی شاگردی میں رہا ہو۔(۸) اس کی نیت صالحہ ہو۔(۹) وہ حلم ووقار کے اوصاف کے ساتھ متصف ہو۔(۱۰) بصیرت ومہارت اس کا زیور ہو۔(۱۱) اس کے مناسب ذرائع معاش ہوں۔(۱۲) احوال زمانہ سے واقفیت رکھتا ہو۔(۱۳) بلند کرداری اور عفت کا مالک ہو۔(۱۴) بردباری اور نرم خوئی اس کی سرشت میں ہو۔(۱۵) تقویٰ ودینداری کو لازم پکڑنے والا ہو۔(۱۶) مسائل پر عبور اور قواعد کا علم رکھتا ہو۔(۱۷) اس کا دماغی توازن درست ہو۔(۱۸) مناسب ظاہری ہیئت رکھتا ہو۔(۱۹) شگفتہ مزاج ہو۔(۲۰) اور یقین واعتماد کی خوبی سے مالا مال ہو۔(۳۱)

یہ تفصیل اس بات کی دلیل ہے کہ فتویٰ دینا ایک حساس معاملہ ہے، جسے ہر کس وناکس کے حوالے نہیں کیا جا سکتا۔جیسا کہ آج کل اس قسم کی آوازیں اٹھ رہی ہیں کہ فتویٰ دینے یا دین کے بارے میں کسی بھی قسم کی رائے دینے کے معاملے میں ہر شخص کو آزادی ہونی چاہئے۔اس لئے کہ اس طرح کی آزادی کا مطلب نعوذ باللہ دینِ متین کی عمارت کو ڈھانے کے مترادف ہوگا۔اس لئے فتویٰ دینے کا اہل بننے کے لئے ضروری ہے کہ آدمی علمِ راسخ کے اسلحے سے مسلح ہو، اس کا فکری افق وسیع ہو اور اس کے ساتھ اس میں پرہیز گاری بھی ہو جو اسے اپنے نفس یا دوسرے لوگوں کی خواہشات کی پیروی سے بچا سکے، ظاہر ہے یہ وہ اوصاف ہیں جن سے عوام تو کیا خواص کی اکثریت بھی محروم ہے۔

فتویٰ دینے کے کچھ اصول وضوابط ہیں، مرکزی دینی مدارس اور جامعات میں باقاعدہ تخصص کرایا جاتا ہے، فتویٰ دینے کیلئے عملی مشق کرائی جاتی ہے، اور جب تک تخصص کرانے والے اساتذہ کو تخصص کرنے والوں کی صلاحیت پر اعتماد نہیں ہو جاتا افتاء کی سند نہیں دی جاتی۔مفتی کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ وہ اپنی ذاتی زندگی میں متقی، پرہیز گار اور شریعت کا پابند ہو۔ہر قابلِ ذکر دینی مدرسہ یا جامعہ فتویٰ دینے کے لئے ایسے ہی علماء کا انتخاب کرتا ہے جو مذکورہ بالا صفات کے حامل ہوتے ہیں۔مفتی جو کچھ بھی فتویٰ دیتا ہے اس میں پوری دیانت ملحوظ رکھتا ہے؛ وہ بحیثیت نائبِ رسول

ﷺ حکمِ شرعی کی نشاندہی کرنے والا ہوتا ہے۔ مفتی فتویٰ صادر کرنے کے لئے کوئی نیا قانون نہیں بناتا، نہ وہ اس کی ذاتی رائے ہوتی ہے، بلکہ وہ تو صرف قانونِ اسلامی کی مقرر دفعہ کو بتلاتا ہے یا وضاحت کرتا ہے جو دفعات اپنے موقع پر کتبِ فقہ وفتاویٰ میں قرآن وحدیث سے ثابت ہوتی ہے۔ اس لئے اسلام کے جس قانون کو مفتی بتلاتا ہے اس کا قرآن وحدیث اور کتبِ فقہ سے ثابت ہونا کافی ہے۔ لہٰذا اگر کوئی شخص مستند فتوے پر طعن کرتا ہے تو درحقیقت وہ قانونِ اسلام کو نشانہ بنارہا ہے۔

کیا فتویٰ کو تبدیل کیا جاسکتا ہے؟

یہ ایک مسلّمہ اصول ہے کہ کسی قانون (حکم) کو یا تو خود قانون ساز بدل سکتا ہے یا اس سے بالاتر شخصیت۔ اس سے کمتر شخصیت کو قانون بدلنے کی اجازت نہیں۔ اگر اللہ نے کوئی حکم دیا ہے تو اللہ ہی اس کو بدل سکتا ہے۔ اسی طرح نبی کے حکم کو یا تو نبی خود بدلے گا یا اللہ کا بھیجا ہوا کوئی دوسرا نبی۔ نبی سے فروتر شخص مثلاً کوئی فقیہ اسے نہیں بدل سکتا۔ اس لحاظ سے اسلامی قانون کے جو احکام قرآن میں ہیں انہیں کوئی اور شخص نہیں بدل سکتا۔

خلاصہ یہ کہ یہ بات ایک مسلّمہ امر ہے کہ شریعت کے بنیادی اصولوں اور اقدار کو تبدیل نہیں کیا جاسکتا، اور چونکہ بے شمار دلائل وبراہین اس امر کے مؤید ہیں اس لئے ہر دور میں امت کا اس بات پر اجماع رہا ہے۔ لہٰذا یہ بات مزید کسی دلیل کی محتاج نہیں۔ البتہ ان اصولوں اور اقدار پر مبنی قوانین میں کارآمد اور فروعی مسائل اور مجتہد فیہ مسائل میں زمانے کے حالات کی تبدیلی سے کسی قدر تبدیلی ممکن ہے۔

عصر حاضر کے ممتاز مذہبی اسکالر علامہ یوسف القرضاوی دامت برکاتہم فرماتے ہیں کہ:

''دس بنیادیں ایسی ہیں جن پر فتویٰ تبدیل ہوسکتا ہے۔ سب سے پہلے مندرجہ ذیل چار بنیادیں ایسی ہیں جن پر فتویٰ میں تبدیلی ممکن ہے''

(۱) وقت میں تبدیلی (۲) جگہ میں تبدیلی (۳) حالات میں تبدیلی (۴) سماجی طریقوں یا روایات میں تبدیلی۔ (۳۲) (قرآن کریم بھی اس معنیٰ میں ''معروف'' کی اصطلاح استعمال کرتا ہے)۔

پھر انہوں نے فتویٰ میں تبدیلی کی چھ مزید بنیادیں ذکر کی ہیں۔

فرماتے ہیں کہ:

یہ چھ مزید بنیادیں بھی ایسی ہیں جن کی بناء پر بسا اوقات فتویٰ میں تبدیلی ہوجاتی ہے:

(۱) لوگوں کی ضروریات میں تبدیلی (۲) لوگوں کی صلاحیتوں میں تبدیلی (۳) علم میں تبدیلی (۴) کسی قہر کے پھیلنے پر (جب کچھ شدید مسئلہ عام ہوجاتا ہے) (۵) اجتماعی سیاسی یا اقتصادی حالت میں تبدیلی (۶) رائے یا فکر میں تبدیلی۔ (۳۳)

یہ دس بنیادیں اصل میں کسی بھی معاشرے کی تمام ممکنہ تبدیلیوں کا احاطہ کرتی ہیں، اس لئے یہ بڑی حد تک واضح ہوتا ہے کہ فقہ کسی بھی طرح جامد نہیں ہے، بلکہ اس میں حالات کے ساتھ ساتھ تبدیلی کی کافی گنجائش موجود ہے۔ اصل میں کوئی بھی قانون اگر جامد ہو تو وہ معاشرے کی ضروریات کو پورا نہیں کرسکتا۔

فتویٰ جاری کرنے کا اختیار کس کو ہے؟

جدید تعلیم یافتہ طبقے کا خیال ہے کہ:

فتویٰ دینے کا حق کسی شخص کا انفرادی معاملہ نہیں، بلکہ یہ ایک کورٹ پروسیجر ہے، لہٰذا کسی بھی معاملے میں فتویٰ صرف حکومت کی مجاز عدالت یا عدالت کا قائم مقام کوئی مجاز ادارہ ہی جاری کرسکتا ہے۔ جیسے اس وقت پاکستان میں اسلامی نظریاتی کونسل اور شرعی عدالت موجود ہے انہیں ہم عدالت کا مجاز قانونی ادارہ کہہ سکتے ہیں، یہ ادارے بھی قانونی تقاضوں کو پورا کرنے کے بعد اپنی رائے کے مطابق فیصلہ جاری کرسکتے ہیں، اور اس طبقے کے خیال کے مطابق کوئی بھی فتویٰ حتمی نہیں ہوتا بلکہ کوئی بھی فتویٰ اپیل پر دوبارہ زیرِ غور آسکتا ہے۔ یہ حضرات اس بات پر شدید اصرار کرتے ہیں کہ اگر کوئی کسی کے خلاف فتویٰ لینا یا دینا چاہے تو اس کو مجاز عدالت یا عدالت کے کسی قائم مقام ادارے سے ہی رجوع کرنا چاہئے جو کہ قانونی تقاضے پورے کرتے ہوئے عدل کے مطابق فتویٰ دے، اور اس سلسلے میں علماء عدالت کی صرف معاونت کرسکتے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں ہمارا جدید تعلیم یافتہ یہ طبقہ علماء و دینی اداروں کو کسی بھی طرح یہ حق دینے کا روادار نہیں کہ وہ اپنے طور پر پرائیویٹ حیثیت میں کوئی بھی فتویٰ جاری کرسکیں۔ یہ طبقہ اپنی تائید میں بنگلہ دیش ہائی کورٹ کے ایک فیصلے کو پیش کرتا ہے جس میں بنگلہ دیشی ہائی کورٹ نے یہ فیصلہ دیا ہے کہ فتویٰ صرف اور صرف مجاز عدالت ہی جاری کرسکتی ہے، اور ایسے تمام فتاویٰ جو کہ قانونی تقاضے پورے کئے بغیر جاری کئے گئے ہیں (جس سے عدالت کی مراد غیر عدالتی فتاویٰ جو عدالتی پروسیجر کے بغیر انفرادی اور پرائیویٹ طور پر دینی شخصیات اور دینی اداروں کی طرف سے جاری کئے گئے ہیں) وہ کالعدم ہیں۔

اس کے برعکس مذہبی طبقہ بالخصوص علماء کرام کا یہ موقف ہے کہ فتویٰ کورٹ پروسیجر نہیں، بلکہ شریعت کی اصطلاح میں زندگی کے کسی شعبہ سے متعلق پیش آمدہ مسائل میں دینی رہنمائی کا نام فتویٰ ہے۔ بالفاظِ دیگر کسی بھی مسلمان کو کوئی مشکل مسئلہ درپیش ہو تو اس کے استفتاء پر قرآن وحدیث اور ان سے اخذ کئے ہوئے اصول وتشریحات کی روشنی میں علمائے دین اور مفتیانِ کرام جو حکمِ شرعی بتاتے ہیں، اسی کا نام فتویٰ ہے۔ لہٰذا فتویٰ دینے کا حق صرف ان علماء ومفتیانِ کرام کو ہے جو علم واجتہاد کی ان شرائط کو پورا کرتے ہوں جو کسی بھی مفتی کے لئے سلف صالحین سے منقول ہیں۔

یہ حضرات اپنے اس موقف پر بہت مضبوط دلائل رکھتے ہیں۔ ہم ذیل میں ان کے دلائل میں سے چند دلیلیں

بطور نمونہ پیش کرتے ہیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس شخص پر شدت کے ساتھ نکیر فرمائی ہے جس نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے دور میں فتویٰ دینے میں جلد بازی سے کام لیا تھا۔اس نے ایک شخص کو جو زخمی تھا اور اسے جنابت لاحق ہوگئی تھی ،فتویٰ دیا تھا کہ اس پر غسل کرنا لازم ہے۔اس نے اس بات کا کوئی خیال نہیں رکھا تھا کہ اس کو زخم ہے۔اس سے وہ آدمی فوت ہوگیا تھا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

قتلوه قتلهم الله ،الاّ سألوا اذلم يعلموا،فانّماشفاء العيّ السّوال،انّمايكفيه أن يتيمّم. (۳۴)

''اسے اپنے ساتھیوں نے ہلاک کیا ہے،اللہ انہیں ہلاک کرے،جب انہیں علم نہیں تھا تو کسی سے پوچھا کیوں نہیں۔مرضِ جہل کا علاج یہ ہے کہ پوچھا جائے۔اس کے لئے تیمم کافی تھا''۔

دیکھیں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے کس طرح ان کے فتویٰ کو اس شخص کے قتل کے مترادف ٹھرایا اور انہیں ان الفاظ میں بددعا دی:قتلهم الله (اللہ انہیں ہلاک کرے)۔معلوم ہوا کہ جہالت کا فتویٰ کبھی ہلاک کرے گا اور کبھی تخریب کا ذریعہ بنے گا۔یہی وجہ ہے کہ ابنِ قیمؒ وغیرہ نے اس بات کے عدمِ جواز پر اجماع نقل کیا ہے کہ کوئی شخص علم کے بغیر دین میں فتویٰ دے۔اسے انہوں نے اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کے ضمن میں لیا ہے کہ وأن تقولوا على الله مالا تعلمون (۳۵)۔''اور یہ کہ اللہ کے نام پر کوئی ایسی بات کہو جس کے متعلق تمہیں علم نہ ہو''۔

ابنِ قیمؒ نے اس بارے میں متعدد احادیث ،آثارِ صحابہؓ اور سلفؒ کے اقوال بھی ذکر کئے ہیں جن سے مدعیانِ فتویٰ ،طفلانِ مکتب دانشوروں کے لئے راستہ بند ہوگیا ہے۔

علامہ ابنِ سیرینؒ فرماتے ہیں کہ ایک آدمی جاہل مرے وہ اس سے بہتر ہے کہ وہ بے علمی کی حالت میں کوئی فتویٰ دے۔(۳۶)

ابوحصین اشعریؒ فرماتے ہیں کہ تم میں سے ایک شخص کسی مسئلے میں بے دھڑک فتویٰ دیتا ہے،لیکن میرا خیال ہے کہ اگر یہ مسئلہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو پیش آتا تو وہ اس کے لئے بدری صحابہؓ کو جمع کرتے (۳۷)

اگر اشعریؒ بے چارے ہمارے دور کو دیکھتے تو پتہ نہیں ان کے دل پر کیا گزرتی۔

حضرت ابنِ مسعود رضی اللہ عنہ اور حضرت ابنِ عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ جس نے ہر اس مسئلے میں فتویٰ دیا جو لوگوں نے اس سے پوچھا تو وہ دیوانہ ہے۔(۳۸)

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ اگر میں وہ بات کہوں جو مجھے معلوم نہ ہو تو کون سا آسمان ہوگا جو مجھ پر سایہ کرے گا اور کون سی زمین ہوگی جو مجھے پناہ دے گی۔(۳۹)

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ اس بات سے میرا سینہ ٹھنڈا ہوتا ہے ۔۔۔ یہ بات انہوں نے تین بار دہرائی ۔۔ کہ آدمی سے ایک مسئلہ پوچھا جائے اور وہ اسے معلوم ہو مگر وہ کہے کہ :اللہ أعلم (اللہ بہتر جانتا ہے)۔(۴۰)

سید التابعین حضرت سعید بن مسیبؒ کا طریقہ یہ تھا کہ وہ جب کوئی فتویٰ دیتے تو یہ ضرور کہتے: اللھم سلّمنی وسلّم منّی ''اے اللہ مجھے بھی محفوظ فرما اور مجھ سے لوگوں کو محفوظ فرما۔(۴۱)

عصرِ حاضر کے معروف محقق علامہ یوسف القرضاوی فرماتے ہیں کہ:

> ''چنانچہ جائز نہیں ہے کہ ایک ایسے عالم کے علاوہ کوئی شخص لوگوں کو فتویٰ دے جسے اپنے علم پر قدرت ہو اور اسے دین کی سمجھ حاصل ہو۔ ورنہ وہ حلال کو حرام اور حرام کو حلال کرے گا، واجبات کو ساقط کرے گا یا لوگوں پر ایسی باتیں لازم کرے گا جو اللہ تعالیٰ نے ان پر لازم نہیں کی ہیں۔ وہ اہلِ ایمان کی تکفیر کرے گا اور کافروں کے کفر کو وجہ جواز فراہم کرے گا۔ یہ ساری چیزیں یا ان میں سے اکثر کی وجہ یہی ہوتی ہے کہ آدمی میں علم و فقہ کی کمی ہو۔ خاص طور پر یہ بات کہ آدمی فتویٰ دینے پر جری ہوتا ہے یا اس کی حرمت کو پامال کرتا ہے یا ہر کس و ناکس کو اس اجازت دیتا ہے تو اس کی وجہ علم کی کمی ہوتی ہے۔ جیسا کہ ہم اپنے دور میں دیکھ رہے ہیں جس میں دین ایک بازیچہ اطفال بنا ہوا ہے کہ چاہے اس کے بارے میں رائے زنی کرے جو کچھ نہ کچھ بول سکتا ہو یا کچھ لکھ سکتا ہو تو وہ دین کے بارے میں کہنا اور لکھنا شروع ہو جاتا ہے۔ حالانکہ قرآن و سنت اور سلف صالحین نے اس کے بارے میں شدت کے ساتھ تاکید کی ہے کہ اس کی شرائط اور اہلیت کے بغیر دین میں رائے زنی نہ کی جائے۔ اور وہ شرائط بھی ایسی ہیں کہ انہیں اپنے اندر جمع کرنا اور ان کی پوری پوری قدرت حاصل کرنا بہت مشکل ہوتا ہے۔'' (۴۲)

یہ سب اس بات کی دلیل ہے کہ فتویٰ دینا ایک حساس معاملہ ہے۔ اور اس کا اہل بننے کے لئے ضروری ہے کہ آدمی علمِ راسخ کے اسلحے سے مسلح ہو، اس کا فکری افق وسیع ہو اور اس کے ساتھ اس میں پرہیزگاری بھی ہو جو اسے اپنے نفس یا دوسرے لوگوں کی خواہشات کی پیروی سے بچا سکے۔

اس مقام پر آ کر آدمی کو جدید تعلیم یافتہ ایسے نام نہاد دانشوروں پر ۔۔ جو اکثر اوقات اس میدان میں نو وارد ہوتے ہیں ۔۔۔ بجا طور پر تعجب ہوتا ہے کہ وہ نازک سے نازک اور حساس سے حساس مسائل میں پوری تعلّی کے ساتھ بے دھڑک فتوے صادر کرتے ہیں۔ اور وہ بڑے بڑے علماء پر دست درازی کرتے ہیں، بلکہ ائمہ عظامؒ اور حتیٰ کہ صحابہ کرامؓ پر بھی تنقید کرنے سے نہیں چوکتے۔ وہ بڑے غرور کے ساتھ نتھنے پھلا کر کہتے ہیں: ھم رجال ونحن رجال (وہ بھی انسان تھے اور ہم بھی انسان ہیں) ایسے لوگوں کے لئے سب سے پہلے تو یہ ضروری ہے کہ وہ اپنی حیثیت پہچانیں، پھر مقاصدِ شریعت میں فقاہت کا مقام حاصل کریں اور زمینی حقائق کو سمجھیں۔ لیکن ان کا غرور ان کے راستے کی ایک بڑی رکاوٹ ہے۔ لاحول ولا قوّۃ الاّ باللہ ۔۔!

معروف محقق ڈاکٹر محمد حمید اللہؒ فرماتے ہیں کہ اسلام کی ایک روایت (Tradition) عجیب وغریب رہی ہے جوکسی اور قوم میں ہمیں نظر نہیں آتی ، وہ یہ ہے کہ عہدِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد سے لیکر آج تک اسلام میں قانون سازی (فتویٰ دینا) ایک پرائیویٹ چیز رہی ہے۔ کبھی حکومت کا اجارہ (Monopoly) نہیں رہی۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ مسلمان فقہاء پوری آزادی کے ساتھ قانون (اسلامی) کی ترقی میں مشغول رہے۔ (۴۳)

ڈاکٹر صاحب مزید فرماتے ہیں کہ:

اگر خلافت (یا حکومت) ایسی ہو جیسی کہ آج کل ہے تو ظاہر ہے کہ حکومت (یا اس کے کارندوں کا اجتہاد (یا فتویٰ) قابلِ قبول نہ ہوگا۔ اس لئے کہ جو قرآن وسنت سے خود استدلال نہ کرسکتا ہو اور اس کی نظر سلف صالحین کی ان تشریحات پر نہ ہو جنہیں اسلام کی اولین تشریح کا مقام حاصل ہے تو وہ کبھی درست اجتہاد نہیں کرسکتا اور نہ ہی درست فتویٰ دے سکتا ہے۔ (۴۴)

لہٰذا جدید تعلیم یافتہ طبقے کا فتویٰ دینے کے معاملے کو عدالتی پروسیجر قرار دیکر اسے حکومتی کارندوں کے حوالے کردینے پر اصرار کرنے کو پورے حسنِ ظن کے باوجود بھی فتویٰ اور مفتی کی مبادیات سے ناآشنائی کا نتیجہ ہی کہا جائیگا۔

علماء ومفتیان کرام پر تنگ نظری کا الزام

جدید تعلیم یافتہ طبقہ کے کچھ لوگ علماء پر جمود اور تنگ نظری کا الزام لگاتے ہیں، اور انہیں دورِ جدید کے تقاضوں سے نابلد اور دقیانوس جیسے القاب سے نوازتے ہیں، حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ علماء کے ہاں وسعتِ نظر بھی ہے اور دورِ جدید کے تقاضوں سے آشنائی بھی۔ اس کی سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ ہر دور کے فتاویٰ کی کتابیں مختلف زبانوں میں چھپی ہوئی ملتی ہیں، ان میں ہر دور کے نئے مسائل بھی درج ہیں اور ان کے جوابات بھی۔ اس کے باوجود جدید تعلیم یافتہ طبقہ کی طرف سے علماء پر تنگ نظری اور جمود کا الزام لگانا یقیناً ان کی کم علمی اور وسعتِ مطالعہ کے فقدان کا نتیجہ ہے۔

فتویٰ کے معاشرے پر اثرات

کسی بھی معاشرے کے لئے فتویٰ کا شعبہ نہایت اہم ہے، اس لئے کہ دنیا کا کوئی بھی معاشرہ وحی الٰہی کے ذریعہ ملنے والے احکامِ خداوندی کی تنفیذ کے بغیر ایک مثالی معاشرہ نہیں بن سکتا اور اس معاشرے میں بسنے والے انسان دینِ متین پر عمل کئے بغیر امن وسکون کی زندگی کبھی بسر نہیں کرسکتے ، اور ظاہر ہے اسی دینی رہنمائی حاصل کرنے کا نام ہی فتویٰ ہے ، لہٰذا ہم کہہ سکتے ہیں کہ فتویٰ کا کسی بھی معاشرے سے براہِ راست تعلق ہے، اور معاشرے کی ترقی فتویٰ کے شعبے سے جڑی ہوئی ہے۔ میری مراد اس سے یہ ہے کہ اگر کسی معاشرے میں مستند علمائے کرام اور مفتیانِ عظام موجود ہوں اور وہ لوگوں کی درست سمت میں دینی رہنمائی کا فریضہ انجام دیتے رہیں تو ان شاء اللہ وہ معاشرہ کبھی زوال کا شکار نہیں ہوسکتا، بلکہ

ان شاءاللہ وہ ایک مثالی معاشرہ ہوگا۔

کسی بھی معاشرے کے لئے فتویٰ کی اہمیت کا اندازہ اس آیت سے بخوبی لگایا جاسکتا ہے جس میں اللہ تعالیٰ نے یہ حکم دیا ہے کہ ہر علاقہ میں سے کچھ لوگ علومِ دینیہ کی تحصیل کے لئے علماء دین کی خدمت میں حاضر ہوکر علمِ دین حاصل کریں، پھر اپنے علاقے کی طرف لوٹ جائیں اور اپنے علاقے کے لوگوں کی دینی رہنمائی کا فریضہ انجام دیں۔ قرآن کریم کے الفاظ ہیں:

فلولانفرمن كلّ فرقة منهم طائفة ليتفقّهوافى الدين ولينذروا قومهم اذارجعواالیهم لعلّهم يحذرون. (۴۵)

''پس ان لوگوں کی ہر جماعت میں سے ایک گروہ کیوں نہیں نکلتا (دین کی تعلیم حاصل کرنے کے لئے) تاکہ وہ دین کی سمجھ (علمِ دین) حاصل کریں اور ڈرائیں اپنی قوم کو جب (تحصیلِ علم کے بعد) ان کی طرف لوٹ کر آئیں، شاید وہ (اللہ سے) ڈریں''

حضراتِ مفسرین نے اس آیت کے ذیل میں لکھا ہے کہ ہر بستی اور ہر علاقہ کے لوگوں پر فرضِ کفایہ ہے کہ وہ کچھ لوگوں کا انتخاب کر کے انہیں دینی تعلیم کے حصول کے لئے علمائے دین کی خدمت میں بھیجیں، اور وہ منتخب لوگ جب تحصیلِ علم کرلیں تو اپنے علاقے کی طرف لوٹ کر جائیں اور اہلِ علاقہ کی دینی رہنمائی کا فریضہ انجام دیں۔ اگر کسی علاقے میں کوئی ایک شخص بھی ایسا عالم نہیں ہے جو لوگوں کی دینی رہنمائی کا فریضہ انجام دے سکے تو تمام اہلِ علاقہ اس فرضِ کفایہ کے ترک کرنے پر گنہگار ہونگے۔ (۴۶)

اسی طرح علماء نے لکھا ہے کہ کسی خطہ زمین میں مسلمان بستے ہوں اور ان کے درمیان ان کی دینی رہنمائی کرنے کے لئے کوئی مستند عالمِ دین موجود نہ ہو تو حاکمِ وقت کی شرعی ذمہ داری ہے کہ وہ ان مسلمانوں کے لئے کسی مستند عالم کا انتظام کرے جو ان کی دینی رہنمائی کرسکے۔ چنانچہ علامہ طحطاویؒ نے عالمگیری کے حوالے سے لکھا ہے کہ: وعلى ولى الأمرأن يبحث عمن يصلح للفتوىٰ ويمنع من لايصلح (۴۷) حاکمِ وقت کا فرض ہے کہ وہ فتویٰ کے لائق ترین افراد کو تلاش کرے، اور جو اس منصب کے لائق نہ ہو اسے فتویٰ دینے سے منع کرے۔

اس لئے کہ اسلام نے عام مسلمانوں پر ضروری قرار دیا ہے کہ انہیں جب کسی معاملہ میں دینی رہنمائی مطلوب ہو تو حکمِ خداوندی معلوم کرنے کے لئے مفتیانِ کرام کی طرف رجوع کریں، جیسا کہ حضرات صحابہ کرامؓ درپیش دینی معاملات میں حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف رجوع کرتے تھے، اور جس طرح حضراتِ صحابہ کرامؓ کے زمانے میں دیگر صحابہ وتابعین فقہائے صحابہؓ سے دینی رہنمائی حاصل کرتے تھے۔ قرآن کریم میں ارشاد ہے: فاسئلوا اهل الذكران كنتم لاتعلمون (۴۸) ترجمہ ''سو پوچھو یاد رکھنے والوں سے اگر تم کو معلوم نہیں'' (سورہ نحل آیت نمبر ۴۳)

دوسری جگہ ارشاد ہے: واتّبع سبیل من اناب الیّ (۴۹) "اور راہ چل اس کی جو رجوع ہوا میری طرف"۔

فتویٰ جاری کرنے میں امت کے اجتماعی مصالح کی رعایت

مفتی کا فریضہ ہے کہ جب مسلمان اپنے پیش آمدہ مسائل کے سلسلے میں اس کی طرف رجوع کریں تو جواب دینے میں پوری بصیرت سے کام لے، اور خوب سوچ سمجھ کر جواب دے، اور شریعت کے دائرے میں رہتے ہوئے اپنے جواب میں امت کے اجتماعی مصالح کی رعایت کرے، اگر کوئی سہل پہلو ہو تو اسے اختیار کرے۔ اپنے جواب میں اس قول کو اختیار کرے جو علمائے مذہب کے نزدیک راجح ہو، مرجوح کو ہرگز اختیار نہ کرے، الا یہ کہ کوئی ایسی خاص وجہ ہو اور دلائل کی روشنی میں یہی راجح نظر آئے۔ جو چیزیں بغیر کراہت جائز ہیں، اور شریعت میں ان کے لئے رخصت ہے مفتی کو چاہئے عوام کے لئے ایسے سہل پہلو کو اختیار کرے اور اس پر فتویٰ دے۔

حضرت شاہ ولی اللہؒ لکھتے ہیں:

وفی عمدۃ الأحکام من کشف البزدوی یستحب للمفتی ألأخذبالرخص تیسراَعلی العوام مثل التؤضی بماء الحمام والصلوٰۃ فی اماکن الطاھرۃ بدون المصلیٰ (۵۰)

"کشف البزدوی کے حوالہ سے عمدۃ الاحکام میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ مفتی کے لئے مستحب ہے کہ عوام کی آسانی کی غرض سے رخصتوں پر فتویٰ دے، جیسے حمام کے پانی سے وضو کرنا اور پاک جگہوں میں بغیر جائے نماز کے نماز پڑھنا"

مفتی کو چاہئے کہ لوگوں کو ایسی بات کا فتویٰ دے جو ان کے حق میں زیادہ آسان ہو، بالخصوص کمزوروں کے لئے آسان تر ہو۔ اس وجہ سے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جب حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ اور حضرت معاذ بن جبلؓ کو یمن روانہ کیا تو ارشاد فرمایا "تم دونوں آسانی کرنا تنگی نہ کرنا"۔ (۵۱)

اسی طرح اگر کسی مسئلہ میں دو صحیح اقوال ہیں، تو مفتی اپنی صواب دید اور مصلحتِ وقت کے پیشِ نظر کسی بھی قول پر فتویٰ دے سکتا ہے۔ صاحب الاشباہ والنظائر لکھتے ہیں:

المفتی انمایفتی بمایقع عندہ من المصلحۃ کمافی مھر البزازیۃ (۵۲)

"مفتی بلاشبہ اس مصلحت پر فتویٰ دیتا ہے جسے وہ مناسب جانتا ہے جیسا کہ فتاویٰ بزازیہ کے باب المھر میں ہے۔"

اس پر صاحبِ حموی لکھتے ہیں کہ یہاں پر مفتی سے مراد وہ مفتی ہے جو مجتہد ہو ورنہ مقلد مفتی پر تو لازم ہے کہ وہ قولِ صحیح پر فتویٰ دے چاہے اس میں مستفتی کی مصلحت ہو یا نہ ہو۔ (۵۳)

کن حالات میں مذہبِ غیر پر فتویٰ دیا جاسکتا ہے؟

جہاں تک مذہبِ غیر پر فتویٰ دینے کا معاملہ ہے تو علماء نے اس سلسلے میں فرمایا ہے کہ عام حالات میں مفتی کو لازم ہے کہ وہ اپنے ہی مذہب پر فتویٰ دے۔ خاص طور پر اس وقت جب مستفتی بھی اسی مذہب کا پیروکار ہو جس مذہب کا پیروکار خود مفتی ہے۔ بغیر شدید مجبوری کے خروج عن المذہب کو علماء نے ناجائز لکھا ہے، البتہ اگر اضطرار کی سی کیفیت ہو یا بات امت کے اجتماعی مفاد کی ہو یا کسی خاص مسئلے میں مفتی مذہبِ غیر کو کسی قوی دلیل کی بنیاد پر راجح سمجھتا ہو تو ایسی صورت میں وہ دوسرے مذہب پر بھی فتویٰ دے سکتا ہے۔ علماء نے یہ بھی لکھا ہے کہ اگر مستفتی کسی دوسرے مذہب کا پیروکار ہو تو مفتی کو چاہئے کہ اسے خود جواب دینے کی بجائے اسے اس کے مذہب کے مفتیوں کی طرف بھیج دینا چاہئے۔ تاہم اگر وہ مفتی اور مستفتی کسی ایسے علاقے میں بستے ہوں جہاں دوسرے مذہب کے مفتی میسر نہ ہوں تو ایسی صورت میں مفتی مستفتی کے مذہب کی بنیادی کتب سے استفادہ کر کے اس مستفتی کو جواب دے سکتا ہے۔

مذہبِ غیر پر فتویٰ دینے کا معاملہ ہندوستان میں اس وقت اپنی شدت کے ساتھ پیش آیا تھا جب بہت سارے ہندوستانی مسلمان سپاہی خلافتِ عثمانیہ مدد و نصرت کے لئے مسلمان فوج کا حصہ بنے اور بعد میں ان میں سے بہت سارے لاپتہ ہو گئے، اور ان کے زندہ یا مردہ ہونے کی کوئی اطلاع نہیں تھی ایسے میں ان مسلمان سپاہیوں کی بیویاں علماء کے پاس اپنا معاملہ لیکر فتویٰ کے لئے حاضر ہوتیں تاکہ وہ دوسرا نکاح کر سکیں، تاہم مذہب حنفی میں ایسی خواتین کو اپنے شوہروں کا نوے پچانوے سال انتظار کرنے کا حکم ہے، اگر اس کے بعد بھی ان شوہر واپس نہ آئیں اور نہ ان کے زندہ ہونے کی کوئی اطلاع ہو تو انہیں مردہ سمجھ کر اپنی عدت پوری کر کے دوسرا نکاح کر سکتی ہیں۔

ظاہر ہے یہ ایسی بے سہارا خواتین کے لئے ایک نہایت صبر آزما اور سخت مشکل حکم تھا، سو ان خواتین نے اپنے لاپتہ شوہروں کے نکاح سے چھٹکارہ پانے کے لئے ارتداد کا سلسلہ شروع کیا، یقیناً یہ صورتحال مسلمانوں کے لئے باعثِ تشویش تھی اس وجہ سے اس زمانے کے علماء و مفتیان کرام نے مذہب غیر پر فتویٰ دیا اور ایسی خواتین کو مذہب مالکی کے مطابق صرف چار سال انتظار کرنے کے بعد عدالت یا کسی پنچائیت کے ذریعے تنسیخ نکاح کا حق دے دیا۔ اس مسئلہ کی تفصیل اور مذہبِ غیر پر فتویٰ دینے کی شرائط پر مشتمل کتاب ''الحیلۃ الناجزۃ'' طبع شدہ موجود ہے۔

جیسے جیسے سائنسی ایجادات نے ترقی کی اور کے ان ایجادات کے نتیجے میں دنیا گلوبل ویلیج بن گئی اور پوری دنیا کے مسلمان (جو مختلف مسالک کے پیروکار تھے) تیزی سے ایک دوسرے کے قریب آئے اور ان کی دلچسپیاں اور مفادات ایک جیسے ہو گئے تب سے مذہبِ غیر پر فتویٰ دینے کی زیادہ ضرورت محسوس کی جانے لگی۔ اس کی ایک مثال حج کا فریضہ بھی ہے کہ سفری سہولتوں کی وجہ سے روز بروز حاجیوں کی بڑھتی ہوئی تعداد کے پیشِ نظر سب مسلمانوں کیلئے اپنے

اپنے مسلک کے مطابق حج کے تمام مناسک ادا کرنا کچھ آسان نہیں رہا۔اس وجہ سے اب علماء کئی مسائل میں حنفی المسلک مسلمانوں کو بھی سعودی عرب میں رائج مسلک حنبلی کے مطابق مناسک ادا کرنے کی اجازت دیتے ہیں۔مثلاً مذہب حنفی کے مطابق طوافِ زیارت کے بعد کی رمی کا صحیح وقت زوال کے بعد شروع ہوتا ہے،اور فقہ حنفی کی کتبِ فتاویٰ میں یہی حکم لکھا ہوا ہے کہ رمی زوال کے بعد کی جائیگی۔تاہم اب سعودی حکومت نے لوگوں کے ازدحام کی وجہ سے زوال سے قبل بھی رمی کرنے کی اجازت دی ہے،اور علمائے حنفیہ بھی اب اس سلسلے میں زیادہ سختی نہیں برتتے۔بلکہ زوال سے قبل کی ہوئی رمی کو بھی کافی سمجھتے ہیں۔

اسلامی بینکوں میں رائج طریقہ ہائے تمویل میں مذہبِ غیر پر فتویٰ

اسی طرح اسلامک بینکنگ اینڈ فائنانس کا معاملہ بھی ہے کہ یہ تمام مسلم دنیا کی ضرورت ہے اور اس وقت تقریباً پوری مسلم دنیا میں اسلامی بینک کام کر رہے ہیں،اور اسلامی طریقوں سے لوگوں فائنانسنگ کی سہولت دے رہے ہیں،تاہم اسلامی بینکوں کے عملی کام کے دوران بہت سے ایسے معاملات آتے ہیں کہ کسی خاص مسلک پر رہتے ہوئے ان معاملات سے نمٹنا آسان نہیں ہوتا،ایسے میں اسلامی فائنانس کے ماہرین جن میں تمام مسالک کے علماء شامل ہیں،مذہب اہلِ سنت والجماعت کے تمام مسالک حنفیہ،شافعیہ،مالکیہ،حنبلیہ کے مآخذ میں غور وفکر کر کے تمام مسلم دنیا کیلئے کوئی قابلِ عمل حل نکالتے ہیں۔اس وقت بھی اسلامی بینکوں میں رائج فائنانسنگ کے طریقوں میں کچھ معاملات مالکی مذہب کے مطابق انجام دیئے جاتے ہیں۔ان میں سرِ فہرست معاملہ التزام بالتصدق کا ہے۔

التزام بالتصدق کی تفصیل

التزام بالتصدق کی تفصیل یہ ہے کہ ایک بینک یا مالیاتی ادارہ جب کسی شخص کے ساتھ کوئی معاملہ کرتا ہے اور اس کے نتیجے میں اس شخص کے ذمہ بینک یا مالیاتی ادارے کی بطور دین کچھ ادائیگی واجب الاداء ہو جاتی ہے،اور وہ شخص بغیر کسی عذر کے بھی وقت ادائیگی نہیں کرتا جس سے بینک یا مالیاتی ادارے کو شدید نقصان کا سامنا کرنا پڑتا ہے،اب اگر بینگ کلائنٹ سے کچھ رقم بطور جرمانہ وصول کرے جیسا کہ عام سودی بینک وصول کرتے ہیں تو یہ سود ہونے کی بناء پر ناجائز ہے،اور اگر نادہندہ سے کچھ بھی وصول نہ کیا جائے تو اس سے بددیانت شخص کو مزید ترغیب ملے گی کہ وہ مسلسل نادہندگی کرتا رہے،تو اس مسئلے کے حل کے لئے اسلامی فائنانس کے ماہرین نے غور وخوض کیا اور مذہبِ مالکی میں بیان کردہ ایک فقہی قاعدے پر مبنی ایک حل پیش کیا،جسے پوری مسلم دنیا کے اسلامی مالیاتی اداروں نے قبول کیا جس سے ان کی وہ مشکل دور ہوگئی۔

وہ حل یہ ہے کہ مرابحہ کے عقد میں داخل ہوتے وقت کلائنٹ یہ ذمہ داری قبول کرے کہ وقت پر ادائیگی نہ

کرنے کی صورت میں وہ بینک کے انتظام میں چلنے والے ایک خیراتی فنڈ میں ایک متعین رقم جمع کرائے گا۔اس میں یہ یقین دہانی ضروری ہے کہ اس رقم کا کوئی حصہ بینک کی آمدن کا جز نہیں بنے گا، بینک اس مقصد کے لئے ایک خیراتی فنڈ قائم کرے گا اور اس مد میں حاصل ہونے والی رقم کو صرف اور صرف شریعت کے مطابق خیراتی مقاصد کیلئے ہی خرچ کیا جائے گا، بینک اس خیراتی فنڈ سے مستحقین کو بلاسود قرضے بھی دے سکتا ہے۔

یہ تجویز بعض مالکی فقہاء کے بیان کردہ ایک فقہی قاعدے پر مبنی ہے، بعض مالکی فقہاء فرماتے ہیں کہ اگر مقروض سے یہ مطالبہ کیا جائے کہ وہ بروقت عدمِ ادائیگی کی صورت میں اضافی رقم ادا کرے گا تو یہ صورت تو جائز نہیں ہے، اس لئے کہ یہ سود لینے کے مترادف ہے، لیکن قرض دہندہ کو بروقت ادائیگی کی یقین دہانی کرانے کے لئے مقروض یہ ذمہ داری قبول کرسکتا ہے کہ وہ بروقت عدمِ ادائیگی کی صورت میں کچھ رقم بطور خیرات دے گا۔یہ درحقیقت یمین (قسم) کی ایک صورت ہے جو کسی شخص کی طرف سے خود اپنے اوپر عائد کردہ ایک سزا ہے، تاکہ وہ خود کو نادہندگی سے بچا سکے، عام حالات میں اس طرح کی یمین (قسم) سے اخلاقی اور دینی ذمہ داری عائد ہوتی ہے، اور عدالت کے ذریعے اس پر عمل درآمد نہیں کرایا جاسکتا، لیکن بعض مالکی فقہاء کے نزدیک اسے قضاءً بھی لازم قرار دیا جاسکتا ہے۔اور قرآن وسنت میں کوئی ایسی بات نہیں ہے جو اس طرح کی یمین کو عدالت کے ذریعے قابلِ عمل قرار دینے میں مانع ہو۔لہٰذا جہاں واقعتاً ضرورت ہو وہاں اس نقطہ نظر پر عمل کیا جاسکتا ہے۔

جدید مسائل (بالخصوص اسلامک فائنانس ودیگر مالی معاملات) کے متعلق فتویٰ جاری کرنے کا منہج:

ہر دور میں مفتیانِ کرام کو ایسے بہت سارے مسائل کا سامنا کرنا پڑتا ہے جو اسی دور کی پیداوار ہوتے ہیں جس دور سے وہ مفتیانِ کرام خود گزر رہے ہوتے ہیں، ان مسائل کا حل ان مفتیانِ کرام کو اپنے پیش روؤں کے یہاں نہیں ملتا، اس لئے کہ ان کے پیش روؤں کے دور میں یہ مسائل موجود نہیں تھے۔ایسی صورت میں مفتیانِ کرام کے پاس اجتہاد وقیاس کے ذریعہ ان مسائل کا حل نکالنے کے علاوہ کوئی اور چارہ نہیں ہوتا۔

موجودہ دور میں بھی سائنسی ایجادات اور تیزی سے بدلتے عالمی حالات نے ایسے بہت سارے مسائل کو جنم دیا ہے، جو اس دور سے پہلے موجود نہیں تھے۔ویسے تو تقریباً ہر شعبہء زندگی میں نت نئے مسائل آئے روز پیدا ہورہے ہیں اور الحمدللہ علمائے کرام ومفتیانِ عظام ان مسائل کے شرعی حل کے لئے کوشاں نظر آتے ہیں، تاہم موجودہ دور میں مالی معاملات، متعدد جدید تجارتی شکلوں بالخصوص اسلامک بینکنگ اینڈ فائنانس کے حوالے سے کافی سوالات علمائے عصر کے سامنے پیش ہورہے ہیں۔ان سوالات کو حل کرنے کے لئے پہلے تو مسلم دنیا میں انفرادی سطح پر کوششیں ہوتی رہیں، لیکن سوالات کی بہتات نے اس کی گنجائش پیدا کی کہ علماء ان سوالات کے حل کے لئے اجتماعی طور پر غور وخوض کریں، اور امت

کی رہنمائی کا فریضہ انجام دیں۔ چنانچہ ملکی اور عالمی سطح پر ایسے فورم بنائے گئے جن میں ایسے جدید مسائل پر اجتماعی غور وخوض کیا گیا۔ ایسے فورمز میں ''مجمع الفقہ الاسلامی جدہ'' کا نام سرِ فہرست ہے۔ اس مجمع میں پوری مسلم دنیا کے کبار علماء امت مسلمہ کو درپیش مسائل پر غور وخوض کرتے ہیں، اور امت مسلمہ کی رہنمائی کرتے ہیں۔

اس کے علاوہ انٹرنیشنل فورمز میں قطر کے ''مرکز بحوث السنة والسیرة النبویة''، آئرلینڈ کی ''مجلس الاروبی للافتاء والبحوث''، مصر میں قائم ''مجمع البحوث الاسلامیہ''، وغیرہ شامل ہیں۔

ہندو پاکستان اور بنگلہ دیش میں بھی ایسے کئی فورم بنائے گئے ہیں جن میں پورے ملک کے علماء ومفتیان کرام ایسے ہی جدید مسائل پر غور وخوض کر کے عام مسلمانوں کی رہنمائی فرماتے ہیں۔ پاکستان میں سرکاری سطح پر ایسے جدید مسائل پر غور وخوض کے لئے ''اسلامی نظریاتی کونسل'' کے نام سے ایک ادارہ بنایا گیا ہے، جس نے بہت مفید کام کیا ہے، اور اس کونسل کے اجلاسوں میں جدید مسائل پر غور وخوض کے ساتھ پاکستان میں اسلامائزیشن کے حوالے سے بھی کافی سفارشات مرتب کی گئی ہیں۔ بقول شخصے اگر حکومت اسلامی نظریاتی کونسل کی طرف سے موقع بموقع پیش کی جانے والی سفارشات پر ہی عمل کر لے تو ملک میں اسلامی نظام قائم ہو جائے۔ اور پرائیویٹ سطح پر سن ۱۴۱۲ھ میں جدید مسائل بالخصوص غیر سودی بینکاری کے مجوزہ طریقوں پر غور کرنے کے لئے کراچی میں ''مجلس تحقیقِ مسائلِ حاضرہ'' کے نام سے ایک ایسی ہی مجلس قائم کی گئی جو اب تک کام کر رہی ہے۔ اس کے علاوہ مسلم ممالک کے علمائے کبار پر مشتمل ایک مجلس جسے ''المجلس الشرعی'' کا نام دیا گیا ہے اسلامی فائنانس کے حوالے سے درپیش جدید مسائل کے حل کے لئے بہت عمدہ کام کر رہی ہے۔ یہ مجلس پوری مسلم دنیا کے پندرہ ممتاز علماء و اسکالرز پر مشتمل ہے۔ یہ مجلس اسلامی بینکوں کے لئے اب تک کئی معیار تیار کر چکی ہے۔

تحقیق کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان تمام فورمز پر جدید مسائل خاص کر مالی معاملات، جدید تجارتی شکلوں اور اسلامی فائنانس کے حوالے نت نئے مسائل کے حل کے لئے جو طریقہ کار اختیار کیا جاتا ہے، اس میں امت مسلمہ کے اجتماعی مصالح کی رعایت کی جاتی ہے، اور شریعت کے دائرے میں رہتے ہوئے مسلمانوں کو جو رخصت مل سکتی ہے وہ دی جاتی ہے، اس کے لئے مذہبِ اہل سنت کے چاروں مسالک حنفیہ، شافعیہ، مالکیہ، حنبلیہ سے استفادہ کیا جاتا ہے۔

اسلامک بینکنگ اینڈ فائنانس کے مسائل حل کے لئے بحرین میں ''المجلس الشرعی'' لے نام سے ایک مجلس قائم کی گئی ہے جس میں پوری مسلم دنیا سے ایسے پندرہ ماہر علماء کو ممبر بنایا گیا ہے جو علومِ دینیہ پر گہری نظر رکھنے کے ساتھ ساتھ جدید بینکاری کے نظام پر بھی دسترس رکھتے ہوں۔ پاکستان سے مفتی محمد تقی عثمانی دامت برکاتہم اس کے اولاً رکن رکین اور اب اس مجلس کے چیرمین کی حیثیت سے اس مجلس کا حصہ ہیں۔ اس مجلس نے اسلامی بینکوں کے لئے چاروں مذہب

حنفیہ، شافعیہ، مالکیہ، حنبلیہ کی روشنی میں ایسے معیارات تیار کئے ہیں جن کی روشنی میں اسلامی بینک روایتی تمویلی اداروں کی طرف سے اپنے کسٹمرز کو فراہم کی جانے والی سہولیات اپنے کسٹمرز کو اسلامی طریقوں سے فراہم کر رہے ہیں۔

فتویٰ اور میڈیا

عصرِ حاضر میں فتویٰ ہماری قومی اور عالمی میڈیا کا ایک اہم عنوان بن گیا ہے، بسا اوقات میڈیا میں شایع ہونے والے فتاویٰ کو توڑ مروڑ کر پیش کیا جاتا ہے یا اس سے غلط اور بے بنیاد نتائج نکالے جاتے ہیں، اور اس طرح فتویٰ کا اصل مفہوم خبروں کی بھیڑ میں کھو جاتا ہے۔ اور اس سے غلط فہمیاں پیدا ہوتی ہیں۔ اس سلسلے میں میڈیا کو یہ بات محسوس کرنی چاہئے کہ فتویٰ کوئی ایسی چیز نہیں ہے جو آج منظرِ عام پر آیا ہے، بلکہ وہ فقہ اسلامی کی کوئی دفعہ ہے جو ہمیشہ سے مسلّم اور منقّح ہے، فتویٰ کوئی شاہی فرمان بھی نہیں کہ ہر کس و ناکس سے اس پر جبری عمل کروایا جائے۔ فتویٰ دراصل کسی شخص کے خاص معاملے میں حکمِ شرعی دریافت کئے جانے کے وقت اس معاملے کے حکمِ شرعی سے آگاہ کرنے کا نام ہے۔ اس کا تعلق براہِ راست اس شخص سے ہوتا ہے جو سوال کرتا ہے، فتویٰ کے ذریعہ اس شخص کی رہنمائی کر دی جاتی ہے۔

میڈیا میں شایع ہونے والے فتاویٰ سے عام طور پر یہ تاثر قائم ہوتا ہے کہ یہ کوئی نیا فتویٰ اور فرمان جاری ہوا ہے، اس سے عموماً یہ تاثر پھیلتا ہے کہ اب تک اسلام یا مسلمانوں کے یہاں اس سلسلے میں ایسی کوئی بات نہیں تھی، لیکن اب یہ کام منع ہے۔ جب کہ حقیقتِ واقعہ اس کے بلکل برعکس ہے۔ فتویٰ کے ذریعہ اسلام کے ہمیشہ سے طے شدہ مسلّمہ مسائل کی کسی دفعہ کو سامنے لایا جاتا ہے، اور وہ کسی بھی معنیٰ میں کوئی نیا معاملہ نہیں ہوتا۔

تیسری بات یہ ہے کہ اگر میڈیا کسی فتوے کو شایع ہی کرنا چاہتا ہے تو یہ اس کی دیانت و امانت کا تقاضہ ہے کہ پورا فتویٰ من و عن مع سوال و جواب اور فتویٰ نمبر کے حوالے کے ساتھ پبلک کے سامنے پیش کرے۔ میڈیا کو سوال و جواب کے الفاظ میں تصرف کرنا یعنی کمی وبیشی کرنا، تقدیم و تاخیر کر کے الٹ پلٹ کرنا، اپنے طور پر اس کا مفہوم متعین کر کے اپنے الفاظ میں پیش کرنا ہرگز درست نہیں، کیونکہ یہ خیانت ہے، بلکہ سوال و جواب کا پورا متن بعینہٖ شایع کرنا چاہئے، اس طرح کبھی کسی گفتگو یا فون پر بات چیت کو فتویٰ کے عنوان سے شایع کر دیا جاتا ہے، یہ بھی سراسر اصولِ صحافت سے انحراف اور زیادتی ہے۔

اس سلسلے میں خصوصاً مسلمانوں کو چند باتیں ذہن میں ضرور رکھنی چاہئیں، میڈیا میں شایع ہونے والے فتوے کو آنکھ بند کر کے صحیح اور مستند تسلیم نہیں کرنا چاہئے، بلکہ جب تک پورا فتویٰ مع حوالہ سوال و جواب سامنے نہ آجائے یا متعلقہ ادارہ کی طرف ے اس سلسلے میں کوئی وضاحت نہ آجائے اس وقت تک اس سلسلے میں کوئی رائے زنی یا تبصرہ نہیں کرنا چاہئے، پورا فتویٰ یا اس کی وضاحت سامنے آجانے کے بعد جب کہ وہ مسئلہ قرآن و حدیث اور فقہ اسلامی کی روشنی

میں ثابت و مسلّم ہے کسی مسلمان کے لئے جائز نہیں کہ بر سرِ عام اس فتوے کو تنقید کا نشانہ بنائے ، اور مفتیانِ کرام یا فتویٰ جاری کرنے والے ادارے کو طعن و تشنیع کرے۔ ہاں ۔۔! کسی علمی واجتہادی مسئلہ میں علمی اختلاف کا حق ان علماء ومفتیانِ کرام کو ضرور ہے جو علم واجتہاد کی ان شرائط کو پورا کرتے ہوں۔

حوالہ جات

۱۔ القرآن الکریم: الیوسف آیت نمبر ۴۳
۲۔ القرآن الکریم: النمل آیت نمبر ۳۲
۳۔ القرآن الکریم: النساء آیت نمبر ۱۷۶
۴۔ احمد بن حنبل، مسند احمد، مؤسسۃ الرسالۃ، بیروت، ۱۹۹۶ء، حدیث نمبر ۱۷۳۱۳
۵۔ ابو محمد عبد اللہ بن عبد الرحمٰن التمیمی الدارمی، سنن دارمی، انصار السنۃ پبلیکیشنز لاہور، ۲۰۰۵ء حدیث نمبر ۱۳۹
۶۔ مولانا ظفیر الدین، فتاویٰ دار العلوم دیو بند، دار الاشاعت کراچی، ۲۰۰۰ء، ج ۱ ص ۶۳
۷۔ www.wicipedia.org
۸۔ القرآن الکریم: النساء آیت نمبر ۱۹
۹۔ القرآن الکریم: النساء آیت نمبر ۱۷۶
۱۰۔ القرآن الکریم: النساء آیت نمبر ۸
۱۱۔ القرآن الکریم: البینۃ آیت نمبر ۸
۱۲۔ الخطیب العمری ولی الدین محمد بن عبد اللہ، مشکوٰۃ المصابیح، قدیمی کتب خانہ کراچی، ۱۹۸۸ء، باب مناقب صحابہ۔
۱۳۔ علامہ محمد بن ابی بکر ابن قیم الجوزیہ، اعلام الموقعین عن رب العلمین، دار الکتب العلمیہ بیروت، ۱۹۹۱ء، ج ۱ ص ۵
۱۴۔ مولانا ظفیر الدین، فتاویٰ دار العلوم دیو بند، دار الاشاعت کراچی، ۲۰۰۰ء، ج ۱ ص ۶۸
۱۵۔ ایضاً
۱۶۔ محمد امین افندی الشہیر بابن عابدین الشامی، رد المحتار، ایچ ایم سعید کمپنی لاہور، ۱۹۹۹ء، ج ۱ ص ۱۴۹
۱۷۔ ایضاً
۱۸۔ القرآن الکریم: النساء: ۵۹، ۸۳
۱۹۔ احمد بن علی ابو بکر الجصاص، احکام القرآن، دار احیاء التراث الاسلامی بیروت، ۱۹۹۹ء، ج ۲ ص ۲۱۰
۲۰۔ القرآن الکریم: النحل: ۱۶: ۴۳
۲۱۔ القرآن الکریم: القمان: ۱۵
۲۲۔ ابو عیسیٰ محمد بن عیسیٰ بن سورہ الترمذی، سنن الترمذی، دار الکتب العلمیہ بیروت، ۱۹۹۹ء، ج ۲ ص ۹۷
۲۳۔ محمد امین افندی الشہیر بابن عابدین الشامی، عقود رسم المفتی، مکتبہ دار العلوم کراچی، ۲۰۰۳ء ص ۷

۲۴۔علامہ محمد بن ابی بکر ابن قیم الجوزیہ،اعلام الموقعین عن رب العلمین،دار الکتب العلمیہ بیروت،۱۹۹۱ء،ج ۲،ص ۲۵۲
۲۵۔علامہ محمد بن ابی بکر ابن قیم الجوزیہ،اعلام الموقعین عن رب العلمین،دار الکتب العلمیہ بیروت،۱۹۹۱ء،ج ا،ص ۱۲
۲۶۔ایضاً
۲۷۔علامہ یوسف القرضاوی،فی فقہ الأولویات،اردو ترجمہ دین میں ترجیحات،مترجم گل زادہ شیر پاؤ۔منشورات،منصورہ لاہور،۲۰۰۸ء،ص ۹۱
۲۸۔محمد امین افندی الشہیر بابن عابدین الشامی،عقود رسم المفتی،مکتبہ دار العلوم کراچی،۲۰۰۳ء،ص ۸
۲۹۔ایضاً ۳۰۔ایضاً ۳۱۔ایضاً ص ۹
۳۲۔علامہ یوسف القرضاوی،فی فقہ الأولویات،اردو ترجمہ دین میں ترجیحات،مترجم گل زادہ شیر پاؤ۔منشورات،منصورہ لاہور،۲۰۰۸ء،ص ۹۱
۳۳۔ایضاً
۳۴۔محمد ناصر الدین الالبانی صحیح الجامع الصغیر،دار الکتب العلمیہ بیروت،۱۹۹۴ء،ج ا،ص ۶۷۳
۳۵۔القرآن الکریم:الاعراف:۷:۳۳
۳۶۔علامہ محمد بن ابی بکر ابن قیم الجوزیہ،اعلام الموقعین عن رب العلمین،دار الکتب العلمیہ بیروت،۱۹۹۱ء،ج ۲،ص ۲۵۷
۳۷۔ایضاً ۳۸۔ایضاً ۳۹۔ایضاً
۴۰۔احمد بن محمد بن اسماعیل الطحطاوی،طحطاوی علی الدر،دار المعرفۃ بیروت،۱۹۸۹ء،ج ا،ص ۴۹
۴۱۔علامہ محمد بن ابی بکر ابن قیم الجوزیہ،اعلام الموقعین عن رب العلمین،دار الکتب العلمیہ بیروت،۱۹۹۱ء،ج ۲،ص ۲۵۷
۴۲۔علامہ یوسف القرضاوی،فی فقہ الأولویات،اردو ترجمہ دین میں ترجیحات،مترجم گل زادہ شیر پاؤ۔منشورات،منصورہ لاہور،۲۰۰۸ء،ص ۹۱
۴۳۔ڈاکٹر محمد حمید اللہ،خطبات بہاولپور،ادارہ تحقیقات اسلامی اسلام آباد،۱۹۹۲ء،ص ۱۱۹،۱۱۸
۴۴۔ایضاً
۴۵۔القرآن الکریم:التوبۃ:۹:۱۲۲
۴۶۔ابن کثیر حافظ عماد الدین ابو الفداء اسماعیل ابن کثیر،تفسیر القرآن العظیم،مکتبہ تعمیر انسانیت لاہور،۱۹۸۴ء،ج ۷،ص ۴۸۷
۴۷۔احمد بن محمد بن اسماعیل الطحطاوی،طحطاوی علی الدر،دار المعرفۃ بیروت،۱۹۸۹ء،ج ۳،ص ۱۷۵
۴۸۔القرآن الکریم:النحل:۴۳
۴۹۔القرآن الکریم:القمان:۵۱
۵۰۔شاہ ولی اللہ دہلوی،عقد الجید،شاہ ولی اللہ اکیڈمی حیدر آباد،۱۹۹۲ء،ص ۴۳
۵۱۔الخطیب العمری ولی الدین محمد بن عبد اللہ،مشکوٰۃ المصابیح،قدیمی کتب خانہ کراچی،۱۹۸۸ء،ص ۳۹۷
۵۲۔علامہ زین الدین ابن نجیم الحنفی المصری،الاشباہ والنظائر،اصح المطابع نور محمد کراچی،۱۹۹۸ء،ص ۳۱۸
۵۳۔علی بن عطیہ حموی،شرح منظومہ الشیبانی،دار الکتب العلمیہ بیروت،۱۹۹۱ء،ص ۳۱۸

افکار غزالیؒ کے علماء وسلاطین پر پڑنے والے اثرات کا جائزہ

خالد عزیز

ریسرچ اسکالر، شعبہ اسلامک لرننگ، جامعہ کراچی

ABSTACT

Imam Ghazali was a pious,religious,eloquent in relgious faith,fervent and zealous believer of ahle-sunnah.he is truly entitled to called hujjat -ul-islam by virtue of these qualities. when he started off his research, he saw that people were quarreling over faith,surging reigious differences among person like imam ghazlie who had wisdom,and people.naturally, sagacity was very embarrassed.who is on the right path? way to get access the reality of in reality, he adopted sufiisam was unraveled to him,he took up the islam.when the reality islam. because of his best mission of preaching knowledge,sagacity,he was able to stratigies,wisdom.profound among people. spread the teaching of isalm Ghazali It is imperative that we must assess the impact of Imam teaching intoon society.we should consider, how can we put his to the thought of practice.At the same time,we should get access Imam Ghazali so that we can adopt and practice his thought. Only Imam Ghazali thought could resolve problems of all time in the light and teaching of sharia-mutaharah.

تخلیق کائنات اور پیدائش آدم کے بعد پہلا نظریہ حیات جو کہ دین کی صورت میں انسان کو عطا ہوا وہ الہامی تھا،